تحریر: ڈاکٹر لطف علی صورت گر
ترجمہ: شہیر نیازی

ایران، عالمِ اسلام اور مسیحی مغرب*

اسلامی دنیا میں قرونِ وسطیٰ درحقیقت جاگیرداری اور طوائف الملوکی کا دور تھا، اس لیے کہ مختلف صوبوں کے والی (Governors) اگرچہ اصولی طور پر خلافتِ بغداد کے مقررہ اور محکوم ہوتے تھے، لیکن عملی طور پر وہ خود مختار حکمران تھے، اور بسا اوقات یہ حکمرانی وراثت بن جاتی تھی۔ یہ خود مختار حکمران علماء اور تاجروں کی سرپرستی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ان کی داد و دہش کا دور دور چرچا تھا اور اسی وجہ سے شاعر اور علماء قسمت آزمائی کے لیے ان کے درباروں کی طرف سمٹ آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایرانی علماء و فضلاء جن کو یا تو وزیر کی ناراضگی کا مسئلہ درپیش ہوتا، یا علم و فضل کی خاطر خواہ قدر و منزلت نہ ہونے کا دکھ، وہ عموماً کہیں اور جا کر قسمت آزمائی کے گرویدہ رہتے تھے۔

عہدِ عباسی میں بہت سے ایرانی عالم اپنے ملک میں حالات کو ناسازگار پا کر مصر، مراکش اور اندلس جا کر آباد ہو گئے جہاں عباسیوں کے بمقابل مصر میں فاطمی اور اندلس میں اموی حکومتیں قائم تھیں۔ نویں صدی کے آخر میں محمد بن موسیٰ الکتانی الرازی جو "رے" کے باشندہ تھے، بغرضِ تجارت اندلس گئے اور چونکہ عربی ثقافت میں ایک بڑا درجہ رکھتے تھے، اس لیے ان کو پڑھے لکھے طبقہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور امیر محمد بن عبدالرحمان نے ان کو اندلس اور مشرقی ممالک جانے والے وفود کے سلسلہ میں اہم خدمات سپرد کر دیں۔ ان کے لڑکے احمد بن محمد (۸۷۸ء - ۹۵۵ء) نے بحیثیت مؤرخ اور "واقعہ نگار" کے اندلس میں بڑی شہرت حاصل کی۔ علی ابن بندار بر مکی بھی تجارت کی غرض سے اندلس گئے اور آباد ہو گئے اور اسی طرح سہل ابن علی نیشاپوری نے بھی اندلس کا سفر اختیار کیا اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ --- شیخ تاج الدین سرخسی ایران سے ترکِ سکونت کر کے مراکش چلے گئے اور وہاں اُنہوں نے والی مراکش ابو یوسف المنصور کی ملازمت اختیار کر لی۔

صاحبِ نفح الطیب کا کہنا ہے کہ شیخ تاج الدین سرخسی نے کم و بیش ۸۰ کتب و رسائل لکھے تھے

---

* یہ مقالہ ماہنامہ "فاران" (کراچی) بابت جون ۱۹۶۳ء میں "اسلامی مملکت اور مغربی دُنیا پر ایران کا اثر" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

جن میں سے دو کتابیں ماہیت اشیاء اور نظم مملکت (State Management) کے موضوعات پر بہت مقبول ہوئیں، خصوصاً اسلامی ریاست کے مغربی علاقہ میں۔ انھوں نے اپنے سرپرست امیر کی سوانح حیات "عطف الذّیل" کے نام سے لکھی تھی۔ ایرانی علاقہ سلماس کا ایک شہزادہ عمر بن مودود الفارسی البخاری بھی تیرہویں صدی میں اندلس چلا گیا اور اُس نے مراکش میں وفات پائی۔

بعینہٖ اُندلس اور مراکش سے بہت عربوں نے ایران کا سفر کیا اور ایران کے ہر قریہ میں جا کر علماء اور فضلاء سے ملے اور نجوم، دینیات اور فلسفہ پر تبادلۂ خیالات کیا۔ ابتدائی گیارہویں صدی عیسوی میں اشبیلیہ کے رہنے والے محمد بن یوسف بن عداس البرزلی نے ایران کا سفر کیا اور اس نے بغداد، اصفہان اور نیشاپور کا دورہ کیا، اور خاص طور پر اپنے وقت کے بڑے عالموں میں سے ابو نصر ابن حمیل شیرازی اور ابوالحسن مؤید طوسی سے ملاقات کی۔

اجتماعِ مکّہ (حج)

حج کعبتہ اللہ جسے محمد رسول اللہ ﷺ نے فرض کیا[1]، ایرانی فلسفہ کی عالم اسلام میں ترویج کے لیے ایک اور بڑا ذریعہ بنا۔ حج کے موقعہ پر اسلامی مملکت کے ہر گوشہ سے لوگ مکّہ کا سفر کرتے تھے اور پانچ سو میل لمبے صحرا کو عبور کرنے کے لیے بڑے بڑے کاروانوں کی شکل میں تیس چالیس میل روزانہ کی رفتار سے چلتے تھے۔ راہ میں آنے والے نخلستانوں میں پڑاؤ کرتے تھے۔

سمندری راستہ کے علاوہ جو اُس زمانہ تک کشتیوں میں سفر کرنے کے خطرات کی وجہ سے عام نہیں تھا۔ پھر بھی کافی تعداد میں ایران اور ارٹریا سے لوگ کشتیوں ہی کے ذریعہ جدّہ آتے تھے۔ جہاں تک خشکی کے راستوں کا تعلق ہے، مختلف ممالک کے مسافروں نے اجتماعی طور پر پانچ راستے مخصوص کیے ہوئے تھے۔

مثلاً مصری قافلہ صرف مصری حاجیوں کو نہیں لاتا تھا، بلکہ اس میں اندلس، مراکش اور بحرِ قلزم کے دیگر عربی مقبوضات کے حاجیوں کو بھی شامل کر لیتا تھا۔ اسی طرح شام سے آنے والا قافلہ شامی، فلسطینی اور ایشیائے کوچک کے حاجیوں کو براہ دمشق و مدینہ مکّہ لاتا تھا۔ یہی راستہ تجارتی قافلوں کے لیے بھی اختیار کیا جاتا تھا۔ یمنی قافلہ میں جنوبی عرب کے سب حاجی شامل ہوتے تھے۔ نجد کے قافلہ میں عرب کے اندرونی علاقوں کے حاجی شامل کیے جاتے تھے، اور عراقی قافلہ میں ایران کے تمام علاقوں کے حاجی شریک ہوتے تھے جو قافلہ کی روانگی سے قبل ہی بغداد میں جمع ہو جاتے تھے۔

اِن قافلوں میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ ان میں شہزادے، فقیر، تاجر اور عالم سبھی طرح

۱۔ ڈاکٹر صورت گر نے یہ بات غلط لکھی ہے کہ حج کعبتہ اللہ محمد رسول اللہ نے فرض قرار دیا۔ حج، روزہ اور نماز کو مسلمانوں پر اللہ نے فرض کیا ہے۔ (مترجم)

کے لوگ جمع ہو جاتے تھے اور یہ لوگ اس حیثیت سے قافلہ در قافلہ ہوتے تھے کہ ہر ایک علاقہ یا شہر کے مسافر اپنا الگ الگ حلقہ بنا لیتے تھے۔ مکہ معظمہ پہنچنے تک جا بجا منزلوں میں یہ لوگ ایک جگہ قیام کرتے تھے اور اسی طرح خود مکہ میں بھی۔ سب لوگ حج کے بعد اپنے اپنے مذاق کے مطابق فرصت کے لمحات گزارتے تھے۔ جو لوگ عابد و زاہد ہوتے، وہ اپنے خیموں کے اندر مصروف عبادت رہتے اور باقی لوگ دُنیا کی اور دلچسپیوں میں مشغول ہو جاتے۔ مختلف الخیال و مختلف الحال لوگوں کے اس عظیم اجتماع میں دانشمند اور قابل لوگ ایک دوسرے ملک کے عالموں سے ملتے جلتے تھے اور فلسفہ و دینیات کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔

ان لوگوں میں بہت ہی دوستانہ ماحول برقرار رہتا تھا اور یہ لوگ اکثر اپنے سفر ناموں میں مقامی کہانیوں کا اور واقعات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ فارسی کے مشہور شاعر اور معلّم دینیات ناصر خسرو نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ وہ کس طرح باد مخالف کی وجہ سے حج کے لیے مکّہ جاتے ہوئے غراب کے مقام پر قیام کرنے پر مجبور ہوا تھا اور جب اُس کی تمام رقم وہیں خرچ ہو گئی اور پاس پیسہ نہ رہا تو شہر اسوان میں اتفاقیہ ایک شخص ابو عبید اللہ محمد ابن فلّح سے ملاقات ہو گئی جس نے اس کو اپنے ایجنٹ کے نام ایک چھٹی دے دی اور اسے سفر جاری رکھنے کے لیے کافی رقم مل گئی، حالانکہ ابو عبید اللہ ایک اجنبی تھا اور اس کی اُس سے کوئی واقفیت پہلے سے نہیں تھی، اور نہ ہی اس رقم کی واپسی کا کوئی امکان نظر آتا تھا۔

اسی طرح ایک اور موقعہ پر جب وہ معرّہ سے گزر رہا تھا تو عرب کے مشہور نابینا شاعر اور صوفی ابوالعلاء نے اس کا پُرجوش استقبال کیا تھا اور اس کی خاطر تواضع کی تھی۔

فارسی کے مقبول ترین شاعر سعدی نے بھی اجنبی شہروں کے ہمعصر عالموں کی خاطر تواضع کے حوالے دیے ہیں اور ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دور وسطیٰ کے اُن مسافروں کی نسبت جو دُنیاوی سامان لے کر چلتے تھے، وہ مسافر جو علم کی دولت لیے پھرتے تھے، کم خطرہ میں تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سڑکیں ناپید اور ذرائع آمدورفت دشوار و خطرناک تھے۔ سعدی نے "سفر" کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان فضلاء کا ذکر بھی کیا ہے جن کو بغیر کسی زحمت کے سفر باعثِ ظفر بنا۔

سفر کرتے رہنے والے علماء

سفر کرنے والے سیاح قسم کے عالموں کے لیے ہر شہر کے علماء و فضلاء سے ملاقات کرنا نہایت آسان تھا۔ اس لیے کہ یہ لوگ یا تو مسجد میں عام اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے مل جاتے تھے اور یا اپنے مکان پر لوگوں کو درس دیتے ہوئے، جہاں ہر شخص کو اہل ہونے کی صورت میں شرکت کی اجازت تھی۔ ان عام اجلاسوں میں اکثر اجنبی لوگوں نے مقرر پر اعتراض کر کے یا جرح کر کے اپنی حیثیت کو منوایا اور ان لوگوں کی بڑی قدر و منزلت کی گئی۔ سعدی نے اپنی مشہور کتاب "بوستان" میں ایک ایسے

ہی واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

ایک مفلس اور بدحال عالم جس کے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے، ایک مُفتی اور فقیہہ کی محفل میں صفِ اوّل میں جا بیٹھا۔ قاضی کی نظر جب اُس پر پڑی تو اُسے گھورا۔ محافظ اُس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چیخا اور کہا کہ تجھ جیسوں کے بیٹھنے کے لیے یہ جگہ نہیں ہے۔ وہاں پیچھے جا اور اگر وعظ سننا ہو تو اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہ کر سُن۔ ہر آدمی کو یہاں مشاہیر کی جگہ بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس محفل میں مراعات علم و فضل کی بناء پر ملتی ہیں اور درجے شہرت کی بناء پر۔ یہ سُن کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور اُس کے دل سے دھواں سا اُٹھا۔ جب وہ اٹھ کر پیچھے چلا گیا جہاں عام اور معمولی لوگ کھڑے تھے تو علمائے دین نے اپنی بحث کا آغاز کیا اور بڑے غرور سے "ہاں" اور "نہیں" کہنے کے لیے اپنی گردنوں کو جھٹکنا شروع کیا، لیکن ان میں سے کوئی بھی مسئلہ کو حل نہ کر سکا، اور عین اس وقت جب کہ کوئی حل ان لوگوں کو سجھائی نہیں دیتا تھا، یہ مفلوک الحال عالم جو سب سے پیچھے بیٹھا تھا، اُٹھ کر اُن سے مخاطب ہوا اور شیر کی طرح دھاڑ کر کہا کہ دلائل مضبوط و معقول ہونے چاہییں، اس لیے کہ صرف غصّہ سے گلے کی رگیں پُھلا کر کوئی بات نہیں منوائی جا سکتی۔ میں بھی اس دانشمندانہ بحث میں حصّہ لینا چاہتا ہوں۔ اُنھوں نے کہا "بولو! اگرچہ تم اس سلسلہ میں کوئی خاص بات نہیں کہہ سکتے۔" یہ غریب اس حیرت زدہ مجمع میں کھڑا ہو گیا اور اُس نے اپنے زورِ بیان سے سب کے مُنہ بند کر دیے۔ فقیہہ شہر اُس کے استقبال کے لیے اپنی کرسی سے اتر کر نیچے آیا اور اُسے جس کو نظر انداز کیا گیا تھا، بطورِ اعزاز اپنی عبا پیش کی اور کہا "افسوس کہ میں یہ نہ دیکھ سکا کہ تم میں کس قدر قابلیت موجود ہے اور میں تم کو اس طرح خوش آمدید نہ کہہ سکا جس کے تم مستحق تھے۔

ایرانی ادب کی وسیع اشاعت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ عالمِ اسلام میں لوگوں کو کتابوں کی اشد ضرورت تھی اور یہ ضرورت ایران کے ذریعہ زیادہ آسانی سے پوری ہو سکتی تھی جہاں چین سے کاغذ سازی کی صنعت تاجروں کے ذریعہ آئی۔ اُس وقت یہ کاغذ پہلے پہل ریشم کے پھٹے ہوئے ٹکڑوں سے بنتا تھا اور بعد میں ریشمی چیتھڑوں سے بننا شروع ہوا۔ یہ کاغذ پیپرس (Papyrus) یا بھیڑوں کی کھال کی نسبت بہت سستا تھا جس کی کتابیں عوام کو باسانی مل سکتی تھیں، ورنہ اس سے پہلے کتابیں جمع کرنا بہت سے لوگوں کی دسترس سے باہر تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام یورپ کو بھی انہی کارخانوں سے کاغذ سپلائی ہوتا تھا وہ جو شاطبہ (Jativa) میں موجود تھے۔

کتابوں کی ترویج اور قیمتوں میں کمی کی وجہ سے عرب کے ہر بڑے شہر میں کتابوں کی دکانیں

کھل گئیں جہاں ماہرین کی نگرانی میں کتابوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور جہاں تمام عالمِ اسلامی سے کتابیں آ کر بکتی تھیں۔ طلباء اور عالموں کے لیے یہ کتابوں کی دوکانیں ملاقاتوں کا مرکز بن گئی تھیں جہاں وہ کتابوں کے نئے ایڈیشن تلاش کرتے، ان کی قیمت اور موضوع پر تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے۔ بارہویں صدی میں صرف بغداد ہی میں کتابوں کی ایک سو بڑی دکانیں تھیں جو عموماً مساجد کے اردگرد ہوتی تھیں اور جن کے مالک و معاون عموماً مشہور عالم ہوتے تھے۔ عرب کا مشہور شاعر الحریری [؟النظیری] کتابوں کا بڑا مشہور ایجنٹ تھا۔ یہ مشرقی ایران کے علاقہ سجستان کے ایک بڑے کتب فروش ابو حاتم سہل ابنِ محمد سے کتابیں لیتا تھا جس کی بغداد میں بھی ایک بہت بڑی دوکان تھی۔ یہ صرف ایجنٹ اور شاعر ہی نہ تھا، بلکہ تاریخ و جغرافیہ کا بڑا عالم تھا۔

کتب بطور زادِ سفر

بہت سے سیاحی کرنے والے عالم و فاضل لوگ سفر پر روانہ ہوتے وقت اپنے ساتھ کچھ قابل فروخت کتابیں بھی لے لیتے تھے تاکہ اگر راہ میں مالی مشکل پیش آئے تو وہ ان کتابوں کو بیچ کر کام چلا لیں۔ فارسی شاعر ناصر خسرو نے اپنے سفر نامہ میں اسی طرح کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ صحرائے عرب میں اُس کے پاس تمام رقم خرچ ہو گئی اور اُس کے پاس صرف کتابوں سے بھری ہوئی دو ٹوکریاں رہ گئیں جن کو اُس نے بدوؤں کے ہاتھ فروخت کرنے کی کوشش کی، مگر یہ قیمتی سودا اُن کے کام کا نہ تھا اس لیے اسے ناکامی ہوئی۔

کتابوں کی قیمتیں اگرچہ نسبتاً کم ہو گئی تھیں، لیکن ابھی کتابیں اس قدر سستی نہ تھیں کہ ہر آدمی اپنی پسند اور ضرورت کی کتابیں خرید کر جمع کر لے، اس لیے پبلک لائبریریوں کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ وہ لوگ بھی ان کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں جو کتابیں نہیں خرید سکتے۔ ابتداء میں اس طرح کی پبلک لائبریریاں عموماً حاکموں اور حکمرانوں کے ذاتی کتب خانے ہوتے تھے جن کو عوام کے استعمال کے لیے کھول دیا جاتا تھا، اور اس کام کو "کارِ خیر" سمجھا جاتا تھا۔ ابتداء میں یہ کتب خانے صرف طلباء کے لیے تھے، لیکن بعد میں ان کو عام کر دیا گیا اور ان کے ساتھ ایک دوکان بھی کتابوں کی خرید و فروخت کے لیے ہر جگہ قائم کر دی گئی تاکہ آمدنی سے کتابوں میں مزید اضافہ ہو سکے۔ اسلامی دنیا کے اس مشرقی علاقہ کی پبلک لائبریریوں کے علاوہ جن میں ہر شخص جا سکتا تھا، اندلس میں بہت اچھے ذاتی کتب خانے موجود تھے۔ جہاں امراء کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر چیز کے بغیر صبر کر سکتے تھے، مگر ہر ایک کے لیے ایک اچھا ذاتی کتب خانہ ہونا ضروری تھا۔ ان میں سے بعض لوگ علم کی محبت میں ایسا کرتے تھے اور بہت سے امراء اسے صرف شان و شوکت کی وجہ سے ضروری سمجھتے تھے۔

ان کتابوں کے جمع کرنے والے ہر سال میں ایک مخصوص رقم اخراجات میں سے علیحدہ کر لیتے

تھے تاکہ عالم اسلامی میں ہر جگہ سے نئی کتابیں خرید کر اپنے کتب خانہ کی زینت میں اضافہ کریں۔ خلیفہ الحکم المستنصر (۹۶۱ء-۹۷۶ء) نے اندلس سے "الاغانی" کے مصنف ابوالفرج اصبہانی کو اس کی کتاب کی ایک کاپی خریدنے کے لیے ایک ہزار دینار بھیجے تھے اور ایک وفد کو سفر خرچ اور کافی رقم دے کر روانہ کیا تھا، تاکہ وہ علم و حکمت کی اچھی کتابیں خرید کرے۔ ایران سے کتابوں اور قلمی نسخوں کی مانگ نے تجارت کتب کو کافی فروغ دیا اور ہر جگہ دفتر کھولنے اور اپنا نمائندہ مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور اس طرح ایرانی مصنفین کی کتابیں اور رسائل بڑی احتیاط سے نقل ہو کر اور مضبوط جلدوں میں بندھ کر تمام عالم اسلامی اور مغربی ممالک میں فروخت ہونے لگیں۔

اس دوران میں وہ کتب خانے جو صرف طالب علموں اور محققین کے لیے کھلے تھے، اب عوام کے لیے بھی استعمال ہونے لگے۔ ان کتب خانوں کو یا تو عوام کے لیے اس لیے کھولا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کریں اور پھر یا اس لیے کہ ان کو اسلامی درس گاہوں کے ساتھ منسلک کر کے طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے لیے مواقع فراہم کیے جائیں۔ ایسے کالج جن کے ساتھ لائبریریاں بھی ہوں۔ غزنی، مرو، رامہرمز، رے، بخارا، شیراز، ایرانی شہروں میں اور عربی شہروں میں سے بغداد، موصل، بصرہ، حلب، طرابلس (شام)، قاہرہ، قرطبہ اور فاس میں کھولے گئے تھے جہاں سے مقامی اور دوسرے علاقوں کے عالم استفادہ کرتے تھے۔ اور اس طرح بھی ایرانیوں کی تصانیف ضبطِ تحریر میں آنے کے ساتھ ہی مغرب میں پھیل جاتی تھیں۔

اندلس کے علماء اور حکماء نے اپنی تصانیف میں اکثر و بیشتر ایرانی ہمعصر مصنفین کی کتابوں کے بالکل صحیح حوالے دیے ہیں۔ اُن کے یہاں سے نہ صرف عبارتیں نقل کی ہیں، بلکہ حوالوں کے لیے صفحہ بھی درج کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاہرہ اور اندلس کے اساتذہ مشرقی فلسفہ سے کما حقہ واقف تھے، اور مشرقی فلسفہ وہاں کی مساجد اور درس گاہوں میں زیرِ مطالعہ تھا اور عربوں نے جو کچھ یورپ کو دیا، اس میں ان تصانیف کا بڑا حصّہ تھا۔

مغربی دُنیا

نویں صدی سے گیارہویں صدی عیسوی تک "عالمِ اسلامی" اور "عیسائی یورپ" کو ربط و ضبط کے کئی مواقع ہاتھ آئے، اس لیے کہ یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں نے اندلس اور صقلیہ کو فتح کیا اور صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا۔ ان تینوں مواقع میں سے سب سے زیادہ موقعہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے ملا۔ اگرچہ فلسطین کا قبضہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان سالہا سال تک کشت و خون کا باعث بنا رہا، لیکن اس خرابی میں ایک بھلائی کا پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ مشرق و مغرب نے پہلی دفعہ تعلیمی اور ثقافتی میدان میں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا اور سکھایا۔

طویل صلیبی جنگوں کے دوران کا ہے کا ہے "عارضی صُلح" کے مواقع آئے اور اس طرح اہلِ مغرب کو مسلمان حاکموں سے ملنے اور ان کے دربار میں جانے کے مواقع ملے جہاں اُنھوں نے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ کیا۔ اسی طرح اسیرا جنگ بھی "خون بہا" یا تبادلہ کی وجہ سے آزاد ہونے کے ساتھ اپنے ذہن میں مُقیّد کرنے والے کی تہذیب، تمدّن، معاشرت اور اخلاق کی ایک ہلکی سی یاد بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ ان قیدیوں کی زبانی مسلمانوں کی خوش حالی اور شان و شوکت کے قصّے سُن سُن کر اہلِ مغرب کو اسلامی فلسفہ اور ثقافت میں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔

یہی صورت حال ایران کی تھی اور اُس کے ربط و ضبط کی نوعیّت بھی یہی تھی، اس لیے کہ ایران بھی اسلامی سلطنت کا جُزو تھا اور اسی لیے اس کے اثرات عراق، شام، مصر اور اندلس کے حکمرانوں پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ یورپ کے ساتھ ایران کے اُن روابط کے علاوہ بھی جو اسلامی سلطنت کا ایک حصّہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے، وہ اپنی تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے عیسائی دُنیا میں متعارف ہو چکا تھا۔ اٹلی کے سیاح اور تجارتی قافلے چین جانے کے لیے ایران کی تجارتی گزرگاہوں پر ہی چلا کرتے تھے۔ ۱۲۶۹ء میں مارکوپولو ایرانی راستہ سے ہی چین میں قبلائی خاں کے دربار میں پہنچا تھا۔ یہ خلیج فارس کے شمالی جزیرہ ہرمُز میں اترا تھا جو مشرقی و مغربی تاجروں کی ملاقات کا بڑا مرکز تھا۔ یہاں سے چل کر اس نے ایران کے مشرقی علاقہ کا سفر کیا اور وسط ایشیا کے علاقہ بدخشاں میں پہنچ گیا۔ اس کی باریک بیں نظر نے ایرانیوں کے اخلاق و عادات کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہاں سے ان کی کتابیں خریدیں اور قدیم کہانیاں اپنے سفرناموں اور تصانیف کی زینت کے لیے حاصل کیں جو یورپ والوں کے لیے بہت دلچسپی کا باعث ہیں۔

وُفود کی ایران کو روانگی

ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اُن سے خطرہ کی بناء پر عیسائی حکمرانوں اور اسقف کو دشمن سے محفوظ رہنے اور اپنا دائرہ وسیع کرنے کے لیے مزید دوستوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور اُنھوں نے براہِ ایران خیر سگالی کے چند وفود چین اور ترکستان کے مغل شہنشاہوں کے پاس بھیجے تاکہ سلجوقیوں کے خلاف ان کو مدد مل جائے۔ ۱۲۴۵ء میں پوپ انوسینٹ چہارم نے دو وفود صرف اس لیے روانہ کیے تھے کہ وہ ایشیا میں مغلوں کے متعلق اطلاعات فراہم کریں۔ کئی مہینے کی مشقّت برداشت کرنے کے بعد یہ وفود جولائی ۱۲۴۶ء میں مغل شہنشاہ Guyuk کے دربار میں پہنچے تھے۔ ۱۲۴۸ء میں فرانس کے بادشاہ لوئس نہم نے اپنے ترجمان فرائر اینڈریو کو اور دوسرے پادریوں کو خطوط دے کر آرمینیا [؟آرمینیا] کے گورنر الکتائی اور ایران کے مغل حکمرانوں کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے بعد ۱۲۵۲ء میں لوئس نے ایک اور وفد فادر ولیم آف ربروک کی قیادت میں روانہ کیا جو بحرِ اسود کو عبور کر

کے کیسپین کے شمالی حصّہ میں سفر کرتے ہوئے مغلِ اعظم خان منگو کے دربار میں پہنچا تھا۔ ان وفود کے علاوہ بھی اور وفود جنوبی علاقہ میں سفر کرتے ہوئے براہ ایران مغل بادشاہوں تک پہنچے تھے۔ ۱۲۸۰ء میں آرڈر آف مائنر فرائرز (order of minor friars) کے وزیر عمومی بونگریٹیا نے مانٹ کاروینو سے جان ایندریو اور ان کے ساتھیوں کو تبلیغی مشن کی صورت میں چین روانہ کیا تھا۔ جان نے ایران میں بہت عرصہ قیام کیا اور پھر پوپ نکولا چہارم کے نام کچھ پیغامات لے کر واپس ہوا، جہاں سے اس کو دوبارہ ۱۳۸۹ء میں چین جانے اور خانِ اعظم سے ربط وضبط بڑھانے کا حکم ملا۔

ایران کے متعلق معلومات

فرائر جان اور پوپ کلیمنٹ کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بھی ایران کے متعلق یورپ کو قابلِ اعتماد معلومات حاصل تھیں، اور اہلِ یورپ ایرانیوں کے رسم ورواج، عادات اور ادب سے بخوبی واقف تھے۔ لاطینی زبان میں ایک مخطوطہ ملا ہے جس میں "برادر جان" کا روزنامچہ درج ہے۔ یہ ۱۲۸۹ء کا لکھا ہوا ہے اور اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

> برادر جان آف مانٹ کاروینو جو "آرڈر آف مائنر فرائرز" سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے سفر پر روانہ ہوئے اور ایرانی سلطنت میں پہنچے تاکہ وہ کافروں کو تبلیغ کریں۔ برادر جان دیگر پادریوں کے ساتھ شہر تبریز میں جہاں پہلے سے اور پادری موجود تھے، بہت دن تک مقیم رہے اور کافروں کو دینِ مسیحی کی تعلیم دی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان عیسائی مبلّغین کو فارسی زبان اچھی طرح آتی تھی، اس لیے کہ جان نے ایک خط میں پوپ کو لکھا تھا کہ "میں نے لوگوں کو انجیل اور توریت کے عہد نامہ قدیم وجدید سے کئی واقعات کو تصویر میں ظاہر کیا اور ان پر لاطینی اور فارسی زبان میں عبارت کندہ کی ہے۔

اسی دور میں اطالوی تاجروں نے مشرقی دساور کی مانگ کی وجہ سے تقریباً تمام تجارتی راستے اختیار کر لیے تھے۔ وہ یا تو ایران کے شمالی مغربی علاقہ میں تبریز سے ہوتے ہوئے بحرِ کیسپین کے کنارے چل کر ترکستان اور چین جاتے تھے یا خلیج فارس میں جزیرہ ہرمز میں اترجاتے تھے اور پھر ایرانی نخلستانوں میں سے گزرتے ہوئے وہ ترکستان اور چین جاتے تھے اور واپسی پر اپنے ساتھ مشرق کے قصّے کہانیاں بھی یادکر لاتے تھے۔

بہرحال ان تجارتی اور سیاسی روابط سے مغربی ادب پر کوئی علمی اثر نہیں پڑا، اس لیے کہ جو معلومات حاصل کی گئی تھیں، ان کی حیثیت علمی نہیں تھی اور نہ کسی نے تحقیق و اکتشاف کے طور پر محنت سے اُسے حاصل کیا تھا۔ ہاں اُن کہانیوں سے جو مشرق سے واپس آنے والے مغربی تجار اپنی منڈیوں میں بیٹھ کر لوگوں کو سنایا کرتے تھے، [ان سے] مغربی محققین کی مشرقی علوم میں دلچسپیاں

بڑھنا شروع ہو گئیں اور ان کو مشرق کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔

بہر حال مشرق و مغرب کے درمیان جن مقامات پر سب سے زیادہ اسلامی اور عیسائی عالموں کو ایک دوسرے سے واسطہ پڑا اور جہاں ادبی اور علمی معلومات کے تبادلے کے مواقع ہاتھ آئے وہ اُندلس، اٹلی اور شام کے علاقے تھے۔

پہلا مرکز ملاقات

سب سے پہلے اسلامی ادب اور اُس میں چھپے ہوئے ایرانی افکار اہلِ مغرب کو سرزمین اُندلس پر طلیطہ کے شہر سے پہنچے۔ یہ شہر تقریباً چار سو سال سے مسلمانوں کے زیر اقتدار تھا اور یہاں اسلامی ثقافت اور مذہبِ اسلام خوب پھل پھول رہے تھے۔ جب ۱۰۸۵ء میں الفانسو ششم نے اس شہر کو فتح کیا تو معاہدہ میں یہ شرط بھی تھی کہ شہریوں کو اپنے اپنے مذہب پر رہنے کی آزادی ہو گی اور اس کے نتیجہ میں مسلمان اور عیسائی پُرامن طریقے سے دوش بدوش رہے، ایک اور بات جس نے اہلِ مغرب کو اسلام کی طرف متوجہ کیا وہ چند عیسائیوں کی مسلمانوں کے دربار میں موجودگی تھی۔

آرچ بشپ ریمونڈ جو اُندلس کے اُمراء میں سے تھا، اس بات کا دلدادہ تھا کہ عربی فلسفہ کو عیسائیوں تک پہنچائے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اُس نے ایک "دارالترجمہ" قائم کیا اور اس کے انتظامات آرچ ڈیکن ڈومینک گونڈسیلوی (Archdeacon Dominic Gondisalvi) کے حوالے کر دیے اور یہ ہدایت دی گئی کہ وہ فلسفہ اور سائنس پر عمدہ عربی تصانیف کے تراجم پیش کرے۔ اس ادارہ میں بہت سے مترجم کام کرتے تھے اور انہوں نے ارسطو کی کتابوں کے عربی سے تراجم کیے تھے اور ایرانی حکماء میں سے ابن سینا اور فارابی کی کتابوں پر حاشیہ اور شرح لکھی تھیں۔ اور پھر یہاں سے اُن کی نقلیں دُور دراز ملکوں میں فروخت کے لیے پھیلائی گئیں اور پیرس کی یونیورسٹی تو ان متکلمین کی تصانیف کا سب سے بڑا مرکز بن گئی تھی جہاں بہت عمدہ کتابیں جمع کر لی گئیں تھیں۔

۱۲۰۹ء میں بمقام پیرس ایک اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ ارسطو کی کتابیں نہ پڑھی جائیں اور ۱۲۱۵ء میں پاپائے روم نے حکم دیا کہ یونانی مابعد الطبیعات اور نیچرل فلاسفی اور اُس کی شرحوں کا مطالعہ نہ کیا جائے، البتہ عربی سے کیے ہوئے تراجم کچھ نئے اور کچھ پرانے پڑھ لینے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس لیے اب علم کا تمام تر سرچشمہ عربی تراجم ہی تھے۔

ان قوانین سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ یورپ اس وقت تک ایرانی لٹریچر سے واقف ہو چکا تھا۔ اندلس میں طلیطہ کی مشہور مسجد کی لائبریری جو اسلامی ادب و ثقافت کا بہت بڑا مرکز تھی، شمالی علاقہ کے عیسائیوں کے لیے بے پناہ کشش کا باعث تھی۔ چاروں طرف سے عرب مترجمین اُدھر کا رُخ کر رہے تھے۔ ان عربوں میں وہ بھی تھے جو یہودی تھے اور وہ بھی جو عیسائی ہو گئے تھے۔ بہر حال ان لوگوں نے

اندلس کے عیسائیوں کے ساتھ اس کام میں پورا پورا تعاون کیا۔ بارہویں صدی کے مترجمین میں سے دو شخص قابلِ ذکر ہیں، ایک ڈومینکس کنڈی سیلینس (Dominicus cundisalinus) تھا اور دُوسرا جوہنس ہسپے نس (Johannes Hispanus) جس نے فارابی کی مشہور کتاب "کتاب الحکماء"، غزالی کی کتاب الفلسفہ اور ابن سینا کی کتاب "الشفاء" کا ترجمہ کیا جو فلسفہ کی اچھی خاصی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کو فرانسیسی زبان میں Sufficlentia کہا جاتا ہے۔ ۱۱۷۰ء میں اے - ڈی - الفریڈ (Alfredus Anglicus) نے ارسطو کی "علمِ سماوی" کے موضوع پر تصنیف کے ایک حصہ کا اُس ترجمہ سے ترجمہ کیا جو ابن سینا نے کیا تھا۔ شیخ نے ارسطو کی چوتھی کتاب میں بطور ضمیمہ تین ابواب کا اضافہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ De Mineralilus یا De Congelatis کے نام سے کیا گیا تھا۔ اسی طرح اور بھی اُس ایرانی ادب کا طلیطلہ میں ترجمہ کیا گیا جو اندلس میں دستیاب ہو سکتا تھا۔ ۱۱۲۶ء میں نجوم کے خوارزمی جدول ایڈیلارڈ آف باتھ نے ترجمہ کیے تھے۔ قریمونہ (Cremona) کے رہنے والے جیرارڈ (Gerard) نے سکندر افرادوسی (Alexander of Aphrodislas) کی تصانیف کے تراجم میں بھی علم الطب کے معاملہ میں حاشیہ پر شیخ بوعلی سینا کی کتاب "قانون" کے حوالے دیے ہیں۔

دُوسرا مرکز ملاقات

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان دوسرا مرکز ملاقات زیریں علاقہ اطالیہ اور جزیرہ صقلیہ تھے جہاں پہلے پہل مسلمان فاتح کی حیثیت سے آئے اور بعدہ نورمنوں کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت باقاعدہ طور پر بس گئے اور پرامن زندگی گزارتے رہے۔ تیرہویں صدی کی ابتداء میں فریڈرک شہنشاہ (۱۱۹۸ء - ۱۲۵۰ء) ہوا اور جزیرۂ صقلیہ کی باقاعدہ حکومت تسلیم کر لی گئی۔ ولیم فرانس کو پہلے پہل اپنی طالب علمی کے زمانہ میں اور بعد میں بادشاہ بن کر عربوں کی ثقافت و تہذیب کو جاننے کی زبردست لگن تھی، اور خصوصاً نورمنز کے ساتھ اُن کے تعلقات کی تاریخ، اُس کو اپنے صقلیہ کے قیام اور صلیبی جنگوں کے دوران میں مسلمانوں کو قریب سے دیکھنے کے لیے کافی مواقع ہاتھ آئے اور اُس کو مسلمان علماء و فضلاء سے جو کلید بردار خزانۂ علم تھے، ملاقات کا شوق پیدا ہوا، اور اُس نے راہ و رسم پیدا کر لی، اور اُس نے ان کے علم و سائنس کا بڑے ذوق و شوق سے گہرا مطالعہ کیا۔

فریڈرک نے اہلِ مشرق سے متاثر ہو کر کافی حد تک مشرقی لباس اور رسم و رواج کو اختیار کر لیا تھا اور وہ مشرقی علماء سے خود ان ہی کی زبان میں جس پر اُس نے قدرت حاصل کر لی تھی، بڑی آزادی سے فلسفیانہ موضوعات پر بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے خط و کتابت کے ذریعہ اندلس کے مسلمان حکماء سے تعلقات پیدا کیے اور اُن سے بعض اخلاقی مسائل پر تفصیل سے سوالات کیے اور جواب پائے۔ اُس

نے براہ راست خود ابن سبعین عبدالحق سے بھی خط و کتابت کی تھی جو فارابی اور ابن سینا کے نظریات کا پیرو تھا اور ان کی تصانیف پر بڑا عبور رکھتا تھا اور رُوح کے غیر فانی ہونے کا قائل تھا۔ اس نے بھی فریڈرک کے لیے مختصر طور پر ایسا ہی جامع مواد فراہم کیا، جیسا کہ کئی صدی پیشتر یونانی حکماء نے ایران کے بادشاہ نوشیرواں کے لیے فراہم کیا تھا۔

۱۲۲۴ء میں شاہ فریڈرک نے نیپلز یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جس کو بعد میں تھامس ایکوناس (Thomas Aquinas) جیسے عالم نے ایک ایسی درس گاہ بنا دیا جہاں مغربی دُنیا کو عربی علوم سے روشناس کرانے کے لیے بڑے پیمانے پر کام کیا۔ یہیں پر عربی زبان سے لاطینی اور عبرانی زبان میں کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ شہنشاہ فریڈرک کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کی ہی وجہ سے میچل اسکاٹ (Michal Scot) طلیطلہ پہنچا اور دیگر تصانیف کے علاوہ اُس نے ارسطو پر ابن سینا کے مقالات اور خود ارسطو کی "کتاب الحیوان" (De Animalilus) کا ترجمہ کیا اور اس کا انتساب بادشاہ سے کیا گیا۔ ایک دوسرا مترجم جرمنی کا رہنے والا ہرمن (Herman) تھا جس نے فارابی کے "علم الکلام" کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ البرٹ میگنس (Albertus Magnus) اور اُس کا شاگرد تھامس ایکوناس شاہ فریڈرک کے دربار کی علمی سرگرمیوں کی ہی پیداوار تھے۔ متذکرہ بالا تصانیف کی نقلیں شہنشاہ فریڈرک کی خواہش کے مطابق بلوگنا (Bologna)، نیپلز (Naples)، سلرمو (Salermo) اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں تقسیم کی گئی تھیں، اور ان عالمانہ کوششوں کا جو نتیجہ نکلا، وہ یہ تھا کہ مغربی دنیا مشرقی علوم عقلی اور حکمت سے بخوبی واقف ہو گئی۔

تیسرا مرکز ملاقات

شام تیسرا مرکز تھا جہاں مغرب کے نصرانیوں اور مشرقیوں یعنی ایران اور مشرق کے دیگر اسلامی ممالک کے لوگوں کی ملاقاتیں ہوئیں۔ بہت قدیم زمانہ سے اہلِ شام مشرقی ممالک سے وسیع پیمانے پر تجارت کرتے رہے ہیں اور ایک زمانہ میں تو شام مشرقی تجارت کی سب سے بڑی منڈی بن گیا تھا، جہاں سے ہو کر تمام دنیا کا مال ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا تھا۔

اور شام نے اس تجارتی گرما گرمی کے ساتھ ساتھ ایک قوم کی حکمت دوسری قوم تک قرونِ وسطیٰ میں آسانی سے پہنچا دی۔ جب کہ خیالات کا ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا دشوار تھا۔ بغیر کسی شک و شبہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شام ہی وہ جگہ تھی جہاں صدیوں تک دو بڑی سلطنتوں یعنی رومی اور ایرانی سلطنتوں کے درمیان ربط و ضبط کے مواقع فراہم ہوئے۔ شام ہی وہ سرزمین ہے جہاں سے یونانی فلسفہ عدیسہ (Eddisa) اور اطاکیہ سے آکر نصیبین (Nissibis) کے مدارس اور جندی شاپور میں مروج و مقبول ہوا۔ عیسائیت کے آغاز میں جب اُس کے تین مکاتبِ فکر قائم ہوئے تو شام میں کیتھولک چرچ

اور ایران میں نسطوری کلیسیا (Nestorian Church) قائم ہوئے۔

سریانی زبان یکساں طور پر مشرقی و مغربی کلیسیاؤں کی زبان تھی، لیکن اس کے برخلاف خود شام میں خصوصاً عدسیہ، قنسرین اور حرّان میں یونانی زبان پڑھائی جاتی تھی جس کی سرپرستی بعد میں چند سیاسی مصلحتوں کی بناء پر ساسانی بادشاہوں نے بھی کی، اور اس طرح شام نے مغربی دُنیا کو مشرقی فلسفہ کے ساتھ مشرق کی کہانیوں اور حکیمانہ اقوال سے بھی آشنا کر دیا۔

آغازِ اسلام کے بعد یونانی فلسفہ میں مسلمانوں کی دلچسپی کی ابتداء کتابوں کے تراجم سے ہوئی اور حرانیوں نے اس میں سبقت کی جن کا ایرانیوں اور عربوں سے آٹھویں صدی سے دسویں صدی تک یکساں طور پر گہرا ربط و ضبط رہا اور دوسری طرف اپنے مذہب و ثقافت کی وجہ سے عیسائیوں سے بھی ذہنی قرب حاصل رہا۔

شام میں یونانی سے تراجم کا دور آٹھویں صدی سے گیارہویں صدی تک کا زمانہ ہے اور ان میں سے زیادہ تر تراجم سُریانی زبان سے ہوئے جن میں یونانی فلسفی پیلوس پرسا (Palus persa) کی وہ تصانیف بھی شامل تھیں جو اس نے خسرو نوشیرواں شاہِ ایران کے لیے سریانی زبان میں پیش کی تھیں۔

بعد میں زیادہ تر یونانی کتابوں کا ترجمہ براہِ راست یونانی سے کیا گیا۔ اہلِ شام نے دو مضامین میں سب سے زیادہ دلچسپی لی۔ ایک اُس لٹریچر میں جو قدیم تاریخ اور فلسفۂ تصوّف سے عبارت تھا اور جس کے لیے فیثا غورث، سقراط، پلوٹارک، ڈایونیس وغیرہ جیسی عظیم شخصیتوں سے سند لی گئی تھی اور دوسرے منطق تاکہ یونانی تحریروں کو واقعی سمجھا جا سکے۔

نویں صدی عیسوی میں مترجمین نے طب اور علوم طبیعی کی کتابوں کے تراجم پر خاص طور پر توجہ دی، اور بقراط، جالینوس، بطلیموس اور اقلیدس کی تصانیف کا عربی ترجمہ کر لیا گیا۔ اور اس کے بعد ہی شام کے مترجمین نے افلاطون اور ارسطو کی تصانیف کے علاوہ فلاطونس (Plotinus) کی اینیڈز (Enneads)، اسکندر افرادوسی کی شرحیں اور جون فلاپونس (Jhon Philoponus) کی کتابوں کو بھی عربی زبان میں منتقل کر دیا۔ اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ شام علوم و فنون کا مرکز بن گیا اور مشرق و مغرب کے عالموں نے شام کا رخ کیا، تاکہ وہ ارسطو اور دیگر یونانی فلسفیوں کے کارناموں سے کما حقہ استفادہ کر سکیں اور ان پر عبور حاصل کریں، اس لیے کہ ان لوگوں کو یہ کتابیں اُن کے اپنے ملک میں میسّر نہیں آ سکتی تھیں۔

شام تک اہلِ مغرب کے باسانی پہنچنے کے دو اسباب تھے۔ اوّل تو شام میں ان کے ہم مذہب عیسائیوں کی موجودگی اور دوسرے شام کا سمندری راستہ سے اٹلی اور قسطنطنیہ سے اُس کا قرب۔ اسی طرح عربوں اور ایرانیوں کو اس سے بھی زیادہ آسانی اس لیے تھی کہ شام ایک اسلامی علاقہ بن چکا تھا اور ویسے

بھی شام کا دارالخلافہ دمشق جو تجارتی مرکز تھا، اُس راہ میں پڑتا تھا جو مکہ جاتا تھا، اس لیے شام کو دیگر تجارتی مراکز کی نسبت یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہیں مشرقی و مغربی فلسفہ کے امتزاج نے جنم لیا اور یہیں سے پہلے پہل مشرقی فلسفہ، طب اور کیمیا کا فن مغرب میں پہنچا۔ یہاں سے لیڈیا کے مصنّف برسکین کی کتابیں یورپ پہنچیں اور ان کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔

یہ تراجم نویں صدی میں جَون اسکاٹ (John Scotuserrigena) نے کیے تھے۔ ایک مقالہ میں پرسکین (Priscian) نے ایرانی بادشاہ نوشیرواں (۵۳۱ م ق) کے اُن نو سوالوں کا جواب دیا تھا جو نفسیات، طبیعات اور نیچرل سائنس سے تعلق رکھتے تھے۔